© rasailojaraid.com

جمہوریت اور اقتدارِ اعلیٰ

پروفیسر خالد شبیر احمد

اسلام کا تصورِ اقتدارِ اعلیٰ جس قدر صاف اور واضح ہے مغرب کا عطا کردہ تصور اقتدار اعلیٰ اسی قدر ابہام اور تشکیک کا شکار ہے۔ اہل یورپ کے اربابِ فکر ونظر کے سامنے یہ سوال ہمیشہ ایک اہم سوال رہا ہے کہ حاکمیت کس کی ہو اور اقتدارِ اعلیٰ کس کا تسلیم کیا جائے۔ علم سیاسیات کے مفکرین کے ہاں کبھی بھی اس معاملے میں اتفاق واتحاد نہ ہو سکا بلکہ معاملہ اس قدر حد سے تجاوز کر گیا کہ بعض مفکرین نے سرے سے تصورِ اقتدارِ اعلیٰ سے ہی بغاوت کر دی۔ ''نراجیت پسندوں'' کا گروہ اسی نظریے کا قائل ہے کہ ریاست جو کہ اقتدارِ اعلیٰ کا نشان ہے اسے ہی سرے سے ختم کر دیا جائے اور انسان کو بغیر کسی پابندی کے کھلا چھوڑ دیا جائے کہ معاشرے کی تمام قباحتیں خود ریاست کی پیدا کردہ ہیں۔ جو اپنے پاس اقتدارِ اعلیٰ کی طاقت رکھتی ہے اور یہ اقتدارِ اعلیٰ کی طاقت اور قوت اسے قدم قدم پر گمراہ کرتی ہے۔ ریاست کی اساس چونکہ اقتدارِ اعلیٰ کی قوت پر ہے جو اس قوت سے کام لیتے ہیں گمراہ ہو کر بدکردار ہو جاتے ہیں، اور جن کے خلاف یہ قوت استعمال ہوتی ہے وہ شرفِ انسانیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا نراجیت والوں کے ہاں بنیادی اصول یہ ہے کہ ریاست ان سے اطاعت کا مطالبہ نہیں کر سکتی۔ ریاست کے نادرشاہی احکامات معقولیت سے سراسر خالی ہوتے ہیں۔ جن سے انسانی اخلاق رفتہ رفتہ کمزور ہو کے رہ جاتا ہے۔ ریاست اقتدارِ اعلیٰ کے حوالے سے ایک ایسے شر پر مبنی ادارہ ہے جو حق ملکیت کے نظام کی گندگی سے آلودہ نظر آتا ہے۔ ریاست انسان کے نجی ملکیت کے حق کو نہ صرف تسلیم کرتی ہے بلکہ اس کی سرپرستی بھی کرتی ہے۔ جس سے معاشرہ گوناگوں برائیوں کا شکار ہو کر روبہ انحطاط ہو جاتا ہے۔ نجی ملکیت کا حق اور ریاست لازم ملزوم ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو حیات کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی برائیوں میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس لیے ریاست نہیں ہونی چاہیے۔ نراجیت پسند ریاست کے محض اس لیے قائل نہیں ہیں کہ اس کے پاس اقتدارِ اعلیٰ کی طاقت ہے، جو ریاست کو ہر لحہ گمراہی کی طرف دھکیلتی رہتی ہے چنانچہ ان کے ہاں اقتدار اعلیٰ کا تصور گمراہی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ان کا قول ہے:

''فلاں صاحب بہت بلند انسان ہوئے اگر انھیں اقتدار نہ دیا جاتا اور قابلِ صد نفرین وزیر نہ بنتے''

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس نظریے کو پیش کرنے والوں میں

(۱)	بوکونن	bukunin	(۱۸۱۴_۱۸۷۶)
(۲)	طالسطائی	tolstoy	(۱۸۲۸_۱۹۱۵)
(۳)	کراپٹکن	kropotkin	(۱۸۴۴_۹۱۲۱)

سرفہرست ہیں۔

اس کے برعکس اقتدارِاعلیٰ جو تصور برطانوی مفکرین، تھامس ہابز، جان لاک، جان بوڈن روسو اور جان آسٹن کے ہاں ملتا ہے اس کے تحت اقتدار اعلیٰ حدودِ ریاست کے اندر ایک عظیم ترین قوت ہے جسے کوئی چیلنج نہیں کرسکتا۔ جس کا عوام اور اس کی تمام انجمنوں پر مکمل اختیار رہے۔ ان کے نظریات کے مطابق اقتدارِاعلیٰ صرف ریاست کا ہی حصہ ہے، جو قابلِ تقسیم، ناقابلِ انتقال، مطلق العنان اور لامحدود اختیار ہے۔ ریاست اسی اقتدار اعلیٰ کی وجہ سے عظیم ادارہ ہے۔ اس کی عظمت کا اقرار جدید مفکر ہیگل (Hegel) بھی کرتا ہے جو نظریۂ مثالیت کا داعی ہے وہ ریاست کو March of Godon earth قرار دیتا ہے۔ وہ ریاست کی قوت کو اقتدارِاعلیٰ میں خدائی اوصاف تلاش کرتا ہے اور ریاست کو عظیم ترین اور قادرِ مطلق سمجھتا ہے۔ اس طرح ہیگل بھی ہابز، لاک اور آسٹن کی طرح ریاست پر اقتدارِاعلیٰ کی اجارہ داری کو تسلیم کرتا ہے۔

پھر جب زمانہ جمہوری اقدار سے متعارف ہوا، تو اقتدارِاعلیٰ کے اس مغربی تصور میں نئی تبدیلیاں پیدا ہونی شروع ہوگئیں۔ جمہوریت کو فروغ حاصل ہوا تو صنعتی میدان میں بھی اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں، معاشی بنیادوں پر اہم گروہ تشکیل پذیر ہوئے۔ جن کی وجہ سے ریاست کے بارے میں قائم شدہ نظریات یا اقتدارِاعلیٰ کی بالادستی بھی متاثر ہوئی۔ مغربی مفکرین نے اقتدارِاعلیٰ کے تصور کے بارے میں جو کچھ کہا وہ بالکل نئی بات تھی۔ فلسفیوں کا ایک نیا گروہ آگے بڑھا جس نے ریاست کی مطلق العنانیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اقتدارِاعلیٰ کو قابل تقسیم قوت قرار دیا۔ معاشرے کے اندر ریاست کے علاوہ دوسری انجمنوں کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ریاست بھی دوسری انجمنوں کی طرح ایک انجمن ہے جسے سیاسی ضروریات کی تکمیل کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ جب کہ معاشرے کی دوسری انجمنیں معاشی، معاشرتی اور مذہبی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے قائم ہیں اور ان کا کام ریاست کے کام سے کم اہم نہیں ہے لہٰذا اقتدارِ اعلیٰ کی قوت کو محض ریاست کے پاس ہی نہیں رہنا چاہیے بلکہ دوسری تمام انجمنوں میں تقسیم کر دینا چاہیے یہ نظریہ اقتدارِاعلیٰ کے بارے میں ایک نئی سوچ کا حامل تھا۔ جس کے تحت اقتدارِاعلیٰ قابلِ تقسیم قوت قرار پائی۔ فلاسفر کی یہ جماعت تکثیر پرست جماعت کہلاتی ہے اور اس نظریے کو نظریۂ تکثیر پسندی کہا جاتا ہے۔ جرمن فلاسفر گیکی (Gieki) پہلا مفکر ہے جس نے سب سے پہلے اس نظریے کو پیش کیا۔ جدید دور میں لاسکی (Laski) مشہور مفکر ہے جس نے اقتدارِاعلیٰ ریاست کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ساتھ منسلک رکھنے کی مخالفت کی کیونکہ اس کے نزدیک اس طرح انسان کو مقاصد کے حصول میں بہت سی مشکلات پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ لاسکی نے اقتدارِ اعلیٰ کے اس تصور کو چھوڑ دینے کی تلقین کی۔ لِنڈ سے (Lindsy) سرے سے اس اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم ہی نہیں کرتا جو محض ریاست کی ملکیت ہو۔ میٹ لینڈ (Maitland) کول (Cole) کریبے (Krabbe) گلکرسٹ (Guilchrist) بارکر (Brkar) کئی دوسرے مغربی مفکرین اقتدارِ اعلیٰ کی قوت کو معاشرے کی مختلف انجمنوں میں تقسیم کرنے کی حمایت کرتے ہیں۔

اس طرح تکثیر پسندوں کی یہ بات ہابز، لاک، روسو اور آسٹن کے تصورِ اقتدارِ اعلیٰ کے سراسر خلاف ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی ہیگل کے مثالیت پسندی کے نظریے کی نفی کرتی ہے۔

فرانسیسی مفکر روسو نے منشائے عوام میں اقتدار اعلیٰ کی قوت میں مضمر دیکھا اور اس قوت کو ریاست کی بجائے عوام کے ساتھ منسلک کر دیا۔ اس طرح روسو نے جدید جمہوریت کی طرف پہلا قدم اٹھایا لیکن حقیقت یہ ہے کہ جیسے جیسے جمہوریت سیاست کے میدان میں آگے بڑھتی گئی۔ ویسے ویسے جمہوریت میں اقتدار اعلیٰ کا تصور دھندلا، مبہم اور تاریک ہوتا گیا۔ آج جمہوری نظام کی پیچیدگی کے سبب صورت حال یہ ہے کہ کسی جمہوری ریاست میں اقتدارِ اعلیٰ کو قوت کو تلاش کرنا ایک بہت ہی مشکل امر ہو چکا ہے۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے جدید مفکرین علم سیاسیات کو اقتدارِ اعلیٰ کی اقسام میں بانٹنا پڑا تا کہ اقتدار اعلیٰ کا یہ تصور باقی رہے لیکن اس کے باوجود یہ بات بڑے اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ جمہوریت میں اقتدارِ اعلیٰ کا تصور غیر واضح ہے جو عام آدمی کی فکری دسترس سے باہر ہے۔ اقتدار اعلیٰ کی اقسام تو اس لیے بنائی گئی تھیں کہ اقتدار اعلیٰ کا تصور صاف اور واضح رہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان اقسام نے اقتدار اعلیٰ کو واضح کرنے کی بجائے مزید الجھا کے رکھ دیا ہے۔ برائے نام اور حقیقی اقتدار اعلیٰ قانونی اقتدارِ اعلیٰ (طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں) بھی موجود ہے۔ جسے عملی سیاست کے ساتھ بس اتنا ہی سروکار ہے کہ وہ عوام پر انتخاب میں ایک مرتبہ ووٹ دے کر اس کا اظہار کر دیتے ہیں۔ لارڈ برائس کے ہاں عوامی اقتدارِ اعلیٰ جمہوریت کے تصور کی بنیاد بن چکا ہے لیکن جمہوریت کی یہ بنیاد ہی غیر واضح ہے تو پھر اس پر تعمیر ہونے والا جمہوریت کا شیش محل کیسے واضح صورت اختیار کر سکتا ہے۔ کیونکہ اگر عوامی اقتدار اعلیٰ سے مراد تمام باشندوں (عوام) کی مرضی لیا جائے تو یہ بالکل غلط ہوگا۔ کیونکہ تمام باشندے ووٹر نہیں ہوتے۔ پھر عوام کوئی منظّم قوت نہیں ہیں جو اپنی قوت کا منظّم طور پر اظہار کر سکیں۔ اور اگر عوام منظّم قوت نہیں تو پھر یہ غیر منظّم قوت اپنے اقتدار اعلیٰ کے حق کو صحیح استعمال کیسے کر سکتی ہے۔ اگر اقتدار اعلیٰ کی ملکیت صرف اور صرف ووٹروں تک ہی محدود کر دی جائے تو پھر بھی اس کا ابہام دور نہیں ہوتا۔ کیونکہ ریاست کے بہت سے باشندے ووٹ دینے کا حق استعمال ہی نہیں کرتے جنہیں سرے سے حقِ ووٹ حاصل ہی نہیں ہوتا گیٹل کے قول کے مطابق کسی ریاست کے صرف بیس فیصد کو ہی ووٹ دینے کا حق حاصل ہوتا ہے اگر اکثریت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے مفروضے کو مدِ نظر رکھا جائے تو اس کی تہہ میں کل آبادی کی ایک معمولی اقلیت ہی عملی طور پر اقتدارِ اعلیٰ کی مالک نظر آتی ہے جب کہ اکثریت سرے سے عوامی اقتدار اعلیٰ سے نہ تو منسلک ہوتی ہے اور نہ ہی اس کا اظہار کرتی ہے جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عوامی حاکمیت اعلیٰ کا یہ تصور بذاتِ خود مبہم مشکوک اور غیر واضح ہے۔

یہی صورت حال سیاسی اقتدارِ اعلیٰ کی ہے جس میں ووٹروں کے علاوہ سیاسی کارکن، صحافی، دانش وروں کا شمار ہوتا ہے۔ جن کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اپنے سے بڑے افراد یعنی (لیڈران کرام) کی رائے کو معاشرے میں پیش کر کے اس کے حق میں رائے عامہ تشکیل کریں۔ رائے عامہ کی اگر چہ جمہوریت کے اندر بڑی اہمیت ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بیشتر لوگ نہ تو کسی سیاسی معاملے میں دلچسپی لیتے ہیں اور نہ ہی اپنی رائے کو قائم کرنے کی صلاحیت و قابلیت رکھتے ہیں۔ وہ اکثر اوقات ان معاملات سے لاتعلق اور بے خبر ہوتے ہیں جن کے بارے میں ایک رائے ان کے نام سے منسوب ہو جاتی ہے۔ مسٹر لاول (Lovel) کہتے ہیں رائے عامہ کو عوام الناس کی رائے ہونے کے لیے نہ اکثریت کی ضرورت ہے نہ کامل اتفاق کی۔ چند گنے چنے لوگ اپنے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے پورے معاشرے میں کچھ موثر طبقوں کو اپنا ہمنوا بنا لیتے ہیں اور اپنی اس رائے کو رائے عامہ کا لبادہ پہنا کر اس کے بل بوتے پر اپنی دکان سیاست کو چمکاتے رہتے ہیں۔ جس طرح عوام کا عوامی اقتدارِ اعلیٰ سے عملی طور پر کوئی سروکار نہیں ہوتا بالکل اسی طرح عوام کا رائے عامہ کے ساتھ بھی کوئی تعلق نہیں ہوتا کیونکہ حقیقتاً رائے عامہ مٹھی بھر لوگوں کی رائے ہوتی ہے اور دوسرے افراد اس رائے کو سوچے سمجھے بغیر اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن جمہوریت میں اسی رائے عامہ کو حکومت کی بنیاد سمجھا جاتا ہے اور یہی رائے عامہ سیاسی اقتدارِ اعلیٰ کے ساتھ نتھی کر دی جاتی ہے۔ عملی طور پر عوامی اقتدارِ اعلیٰ اور سیاسی اقتدارِ اعلیٰ دونوں ایسے عوامی نعرے ہیں جنھیں آنکھ دیکھنے کی گنہگار نہیں ہے، البتہ کان سننے کے مجرم ضرور ہیں۔ یہی حال آئینی و قانونی اقتدارِ اعلیٰ کا ہے اور پھر برائے نام اور حقیقی اقتدارِ اعلیٰ بھی کوئی اتنے موثر انداز میں کاروبارِ حکومت پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ کیونکہ وزارتی نظام حکومت میں وزیر اعظم اپنی ذمہ داریوں کے سلسلے میں پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہے۔ جسے جس وقت بھی پارلیمنٹ چاہے اپنے منصب سے الگ کر سکتی ہے۔ اب بھلا ایسا حقیقی مقتدر اعلیٰ حقیقتاً مقتدر اعلیٰ ہے بھی جسے ہر وقت اس کے منصب سے اتارا جا سکتا ہو۔ جو اراکین اسمبلی کی حمایت کا محتاج ہو۔ جس کی سوچ، جس کا منصوبہ اور ہر حکمت عملی اور ہر پروگرام کس طرح بھی اس کا اپنا کہلانے کا مستحق نہیں محض پارلیمنٹ سے اس کے نام تھونپ دیا جاتا ہو وہ حقیقی مقتدر کہلانے کا کہاں تک حقدار ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قانونی یا آئینی مقتدر اعلیٰ جو پارلیمنٹ کا دوسرا نام ہے کس حد تک اپنے اس اختیار کو استعمال میں لاتی ہے۔ کیونکہ ہر پارلیمنٹ میں اکثریت اس سیاسی جماعت کی ہوتی ہے جو انتخاب جیت کر پارلیمنٹ میں پہنچتی ہے۔ اب ایک سیاسی جماعت کے ساتھ یہ وابستگی پارلیمنٹ کے ہر رکن کو ان فیصلوں کا پابند کر دیتی ہے۔ جو جماعت کرتی ہے۔ کسی معاملے میں وہ اپنی ایسی انفرادی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رائے کو آگے نہیں بڑھا جا سکتا جس کی حمایت اس کی پارلیمانی پارٹی نہیں کرتی خواہ اس رائے میں عوام، ملک کی فلاح و بہبود کا کتنا ہی راز مضمر کیوں نہ ہو۔ دورِ جدید میں سیاسی جماعتوں کا نظم و ضبط اتنا شدید اور اتنا موثر حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ وزیر اعظم بھی اس کی جکڑ بندیوں سے باہر نہیں جا سکتا۔ چہ جائے کہ پارلیمنٹ کا کوئی رکن اس سے بغاوت کی جرات کرے۔

اس ساری بحث سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ جمہوریت میں اقتدارِ اعلیٰ کا تصور انتہائی کمزور اور مبہم ہے پھر جمہوریت کے حوالے سے جو اقتدارِ اعلیٰ کی اقسام بنا دی گئیں ہیں۔ اس سے تو اقتدارِ اعلیٰ کا تصور مضحکہ خیز ہو کے رہ گیا ہے۔ عوام بے چارے سیاسی اقتدار کے ہاتھوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ جب کہ سیاسی اقتدارِ اعلیٰ، قانونی اور آئینی اقتدارِ اعلیٰ کے سامنے بے بس ہے۔ حقیقی اقتدارِ اعلیٰ قانونی اور آئینی اقتدارِ اعلیٰ کے سامنے سربسجود ہے۔ جب کہ برائے نام اقتدارِ اعلیٰ کو رفتارِ زمانہ سے دستخطوں والی مشین بنا کے رکھ دیا ہے۔ کہ جو کاغذ پارلیمنٹ یا وزیر اعظم کی طرف سے اس کے سامنے پیش کیا جائے اس پر دستخط کر دے اور بس! اس طرح نظام جمہوریت جو جدید دور کا پسندیدہ نظام حکومت ہے اقتدارِ اعلیٰ کے گورکھ دھندوں میں الجھ کر رہ گیا ہے۔

ہے وہ جامہ نہیں جس کا کوئی الٹا سیدھا

لیکن اس کے باوجود اس دور کا دانش ور ایک ایسے نظام حکومت کو پسندیدہ نظام حکومت تصور کرتا ہے جس میں اقتدارِ اعلیٰ کا کوئی واضح تصور سرے سے موجود ہی نہیں

تم جسے چاہو چڑھا لو سر پر
ورنہ یوں دوش یہ کاکل ٹھہرے

جمہوریت میں تو جیسے اقتدار اعلیٰ کا تصور گم ہو گیا ہو، جس کی تلاش میں کئی دروازوں پر دستک دینا پڑتی ہے۔ عوام کے دروازے پر جا کر پوچھنا پڑتا ہے کیا واقعی اقتدارِ اعلیٰ کی قوت آپ کے پاس ہے؟ جواب میں عوام کہتے ہیں کہ ہم میں سے کچھ لوگ حقِ ووٹ سے ضرور سرفراز ہیں لیکن ووٹ دینے کے بعد سب کچھ تو اراکین اسمبلی کے پاس ہوتا ہے۔ جو چاہتے ہیں عوام کے نام پر کرتے چلے جاتے ہیں۔ اصل طاقت تو ملک کی پارلیمنٹ ہے۔ پارلیمنٹ سے سوال کیا جاتا ہے کہ کیا تو مقتدر اعلیٰ ہے؟ تو پارلیمنٹ کی طرف سے جواب ملتا ہے کہ ہمارے ہر کام میں ہماری نکیل تو ملک کے وزیر اعظم کے ہاتھ میں ہے، جس کی ہر بات اور ہر فیصلہ پر ہمیں مہر تصدیق ثبت کرنا پڑتی ہے۔ پھر وزیر اعظم کے مشورے سے پارلیمنٹ کو وقت سے پہلے توڑا جا سکتا ہے۔ اس لیے ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ہاتھ میں ملک کا اقتدار اعلیٰ ہے اگر آپ کو اقتدار اعلیٰ کی تلاش ہے تو پھر آپ ملک کے وزیر اعظم کے پاس جائیے۔ شاید وہ آپ کی اس معاملے میں رہنمائی کر سکیں۔ وزیر اعظم کے دروازے پر دستک دی جاتی ہے تو وہ جواب دیتا ہے کہ میں تو محض عوام کا نمائندہ ہوں جسے ہر وقت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اراکین اسمبلی کو خوش رکھنا پڑتا ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میرے اقتدار کی ڈور پارلیمنٹ کی خوشی اور اراکین کی رضا کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ وہ جب چاہیں مجھے میرے منصب سے علیحدہ کر سکتے ہیں تو پھر میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ میں ملک کا مقتدرِ اعلیٰ ہوں اور اگر یہی سوال صدرِ ریاست سے کر دیا جائے تو صدرِ ریاست جواب میں فرماتے ہیں کہ میں تو صرف مہر تصدیق ہوں۔ جو فیصلہ وزیرِ اعظم اپنی کابینہ کے ہمراہ کرتا ہے مجھے اس کی تصدیق و توثیق کرنا پڑتی ہے۔ جو بھی قانون پارلیمنٹ پاس کر کے میرے پاس بھیج دے۔ مجھے اس کی منظوری دینا پڑتی ہے نام سارا میرا ہی ہے لیکن جہاں تک کام کا تعلق ہے اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے میں کیسے اپنے آپ کو مقتدرِ اعلیٰ کہہ سکتا ہوں۔ پھر اس پہ طرہ یہ ہے کہ مجھے بھی تحریک مواخذہ کے ذریعے منصب سے الگ کیا جا سکتا ہے۔

جس نظامِ حکومت میں اقتدارِ اعلیٰ کا تصور اتنا موہوم، مہمل اور کمزور ہو کر رہ جائے۔ دنیا کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ انسانیت اس نظام کے دروازے پر ہاتھ جوڑے کھڑی ہے کہ اسی دروازے پر اس کے مسائل کا حل موجود ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنی ذاتی اغراض کے لیے عوام کو مسائل کے بھنور میں دھکیل دیتے ہیں وہ اسی نظامِ حکومت میں پناہ حاصل کیے ہوئے ہیں۔ میری مراد سرمایہ داروں سے ہے۔ کہ جن پر سارا نظامِ حکومت جسے جمہوریت کہتے ہیں قائم ہے اور جن کو اگر سارے نظام سے الگ کر دیا جائے تو اس نظام کی ساری عمارت ہی زمین بوس ہو کر رہ جاتی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو جمہوریت میں اقتدار صرف رؤسا، امراء، کی جیب میں ہوتا ہے جو عوام کے نام پر حکومت کے سنگھاسن پر جب تک چاہتے ہیں براجمان رہتے ہیں۔ اس بحث کی روشنی میں کیا یہ کہنا مناسب نہیں ہے کہ جمہوریت سرمایہ داروں کی حکومت کا دوسرا نام ہے جو صرف سرمایہ داروں کے وسائل اور سرمائے کے بل بوتے پر تشکیل پذیر ہوتی ہے اور سرمایہ داروں کے مفاد کے لیے سرگرمِ کار رہتی ہے۔

جہاں تک اسلام کے نظامِ حکومت کا تعلق ہے اقتدارِ اعلیٰ صاف اور واضح ہے کہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی مقتدرِ اعلیٰ ہے باقی سب کچھ اس کے تابع ہے۔ عام فرد تو رہا ایک طرف خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک اس اقتدار میں شامل نہیں کہ وہ وہی کہتے اور کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اسی لیے تو کہا تھا:

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے بس وہی باقی بتانِ آزری

© rasailojaraid.com